Volume 03, Issue 04,
October-December 2025
PP: 1-12
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

ماہ پارہ صفدر کی خودنوشت سوانح حیات کا سماجی و تانیثی تجزیہ

A Social and Feminist Analysis of the Autobiography of Māh Pārah Ṣafdar

Faiqa Fayyaz[1], Dr. Samuira Ijaz[2]

Article History

Received
02-12-2025

Accepted
20-12-2025

Published
25-12-2025

Abstract & Indexing

Abstract

Mahpārah Ṣafdar is a renowned newsreader, columnist, and journalist who began her professional career in 1977 as a newscaster with Pakistan Television (PTV). In 1980, she joined Radio Pakistan News, further strengthening her presence in broadcast journalism. In 1990, she became part of the BBC Urdu Service, where she served for twenty-five years, presenting various programs and contributing columns based on her personal memories and professional experiences for the BBC Urdu website. In 2022, she published her autobiography, Mērā Zamāna, Merī Kahānī, through Jhelum Book Corner. The autobiography is divided into three major parts: the first focuses on her childhood, the second narrates her university life along with reflections on Pakistan's political history from 1970 to 1980, and the third documents her experiences as a journalist working in London with the BBC Urdu Service. Through her life journey, Mahpārah Ṣafdar addresses numerous personal and professional challenges that reflect broader societal issues, particularly social inequality and systemic constraints faced by women within a patriarchal framework. Her narrative highlights the significance of feminist consciousness in interpreting these experiences and illustrates how she negotiated space, agency, and recognition within a male-dominated media industry. The autobiography thus serves as an important text for understanding the intersection of gender, media, and social structures in contemporary South Asian society.

Keywords:

Mahpārah Ṣafdar, Autobiography, Feminist Analysis, Social Analysis, Pakistani Media, Journalism, BBC Urdu Service, Women Journalists, Patriarchal Society.

[1] *MPhil Scholar, Department of Urdu, University of Sargodha, Sargodha.*
[2] *Associate Professor, Department of Urdu Language & Literature, University of Sargodha, Sargodha.*
sumaira.ijaz@uos.edu.pk

All Rights Reserved © 2025 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development

آپ بیتی ایسی صنف نثر ہے جس میں انسان اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو خود قلم بند کرتا ہے۔ آپ بیتی محض احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات لکھنے والے کی داخلی کیفیتوں، دلی احساس، شخصی اور عملی تجربوں، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور مجموعی طور پر زندگی کے بارے میں لکھنے والے کی ترجمانی کرتی ہے۔ خود نوشت سوانح عمری میں ایک فرد اپنی زندگی کی داستان قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سیاسی و سماجی حالات اور تہذیب و ثقافت کو بھی بیان کرتا ہے جس میں اس دور کے رسم و رواج اور دیگر ثقافتی مظاہر اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ کسی بھی دور کی ثقافت، رہن سہن، رسم و رواج، سیاست، سماج وغیرہ کو سمجھنے کے لیے میرے نزدیک آپ بیتی ایک اہم صنف ہے۔ کسی مختص دور کی سماجی، ثقافتی اور معاشی صورتحال سے آشنائی کے لیے جہاں سوانحی ادب مددگار ہوتا ہے، وہاں وہ اس ماحول کی کامیاب تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ انسان پر اس کے ماحول کا اثر دیرپا ہوتا ہے بلکہ جس عہد میں اس نے آنکھ کھولی ہو اس کے اثرات اس کی شخصیت پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ شخص جب بھی کوئی صنف تخلیق کرتا ہے تو اس میں براہ راست یا بالواسطہ اثر اس کے ماحول کا ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ بیتی جہاں اپنی زندگی کے سفر کی داستان کو قلم بند کرنے کا نام ہے وہاں یہ تزکیہ نفس کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

"آپ بیتی میں مواد اپنے اندر سے نکلتا ہے، خود کوزہ و خود کوزہ گر، خود ہی مجرم، خود ہی گواہ، خود ہی جج"[1]

آپ بیتی کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً روزنامچہ، ڈائری، سفر نامے وغیرہ، ان سب میں مصنف اپنی زندگی کے مشاہدات، تجربات اور واقعات کو قلم بند کرتا ہے، چاہے وہ سفر نامے کی صورت کسی سفر کے دوران کسی ایک واقعہ پر مبنی ہو یا پھر زندگی کے مختصر اور محدود پہلوؤں پر واقع ہو، یہ سب آپ بیتی کی ہی مختلف شکلوں کے طور پر جانی جاتی ہیں۔

آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی اس کا صداقت پر مبنی ہونا ہے، کیونکہ یہ سچائی، صاف گوئی، دیانتداری اور جرات اظہار کا زبردست امتحان ہوتا ہے۔ ایک اچھی آپ بیتی لکھنے والے سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام افعال اور اعمال کو من و عن بیان کرے، تمام واقعات کو منطقی ترتیب میں بیان کرے کہ ان میں باہمی ربط موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ قاری کے لیے دلچسپی کا عنصر بھی شروع سے آخر تک موجود رہے۔ آپ بیتی کا صداقت پر مبنی ہونا اور تمام واقعات کا جو اس کی زندگی میں رونما ہوئے یا ایسے مشاہدات جن سے مصنف کو اپنی زندگی میں واسطہ پڑا، ان کا سچا اور حقیقی نقشہ پیش کرنا ایک آپ بیتی نگار پر لازم ہے۔ مصنف کی آپ بیتی میں اس دور کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کا عکس بھی شامل ہوتا ہے یہ خوبی آپ بیتی کو محض ذاتی تجربات کی کہانی سے بڑھا کر ایک تاریخی دستاویز بنا دیتی ہے۔

ماہ پارہ صفدر کا نام پاکستان کی ممتاز نیوز کاسٹرز میں شمار ہوتا ہے۔ ماہ پارہ زیدی 15 نومبر 1954ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ والد سید حسن عباس زیدی شاعر بھی تھے اور شعبہ تدریس سے وابستہ تھے۔ ان کی والدہ سیدہ شمس الزہرہ سوز خواں تھیں۔ ماہ پارہ بھی سوز خوانی، نوحہ خوانی اور حدیث خوانی کرتی ہیں۔ ماہ پارہ چھ بہنوں میں چوتھے نمبر پر ہیں، بچپن میں والدین کے ساتھ خوشاب سے سرگودھا آگئیں اور ابتدائی تعلیم سرگودھا ہی سے حاصل کی (میٹرک، ایف۔اے اور بی۔اے) سرگودھا سے کیا۔ انہوں نے ایم۔اے انگلش پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا اور وہیں سے اپنے نشریاتی سفر کا آغاز 1974ء میں ریڈیو پاکستان لاہور میں ایک یونیورسٹی پروگرام سے کیا، مختلف پروگراموں میں حصہ لیتی رہیں اور پھر ریڈیو کے ساتھ ساتھ لاہور ٹیلی ویژن کے شعبہ نیوز سے منسلک ہو گئیں۔ یہاں انہوں نے 1977ء سے پی ٹی وی کا خبرنامہ پڑھنا شروع کیا جو ملک گیر سطح پر ان کی پہچان کا باعث بن گیا۔ 1979ء میں ان کی شادی صفدر ہمدانی سے ہوئی جو ممتاز براڈکاسٹر مصطفٰی ہمدانی کے بیٹے ہیں۔ صفدر ہمدانی اس وقت ریڈیو پاکستان سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور شاعر بھی ہیں۔ ماہ پارہ 1990ء تک پی ٹی وی سے منسلک رہیں اور جنوری 1990ء میں وہ اپنے دونوں بچوں (زہرا اور محمد) کے ساتھ بیرون ملک چلی گئیں۔ لندن میں بی بی سی کی اردو سروس سے منسلک ہوئیں اور

2014ء تک مستقل ملازمت کے بعد جزوی طور پر بی بی سی سے منسلک ہیں۔ ماہ پارہ صفدر نے بی بی سی سے وابستگی کے دوران برطانیہ میں مقیم خاتون مشرق پر پروگرام سیریز بنانے کے لیے لندن سے سکاٹ لینڈ تک مختلف شہروں کا سفر کیا۔ یورپی یونین کی سربراہ کانفرنس کی ڈبلن سے رپورٹنگ کی، جبکہ ایران میں صدارتی انتخابات کے دوران پروگرام بنانے کے لیے ایران بھی گئیں۔اس دوران انہوں نے نومنتخب صدر احمدی نژاد کی پہلی صدارتی نیوز کانفرنس کی رپورٹنگ کی۔ماہ پارہ نومبر 2006ء سے اب تک عالمی اخبار میں مدیر حالات حاضرہ کے فرائض بھی انجام دے رہی ہیں۔ماہ پارہ صفدر نے اب تک متعدد ایوارڈ حاصل کیے ہیں جن میں پی ٹی وی ایوارڈ 1985، بولان اکیڈمی ایوارڈ، نگار ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔

ماہ پارہ صفدر نے اپنی آپ بیتی "میرا زمانہ میری کہانی" کے نام سے لکھی۔ یہ آپ بیتی دسمبر 2022ء میں پہلی بار بک کارنر جہلم سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اپنے سادہ انداز بیان، دلچسپ، منظم اور جامع بیان کے عوض قارئین کے درمیان اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جولائی 2024ء کو بک کارنر جہلم سے ہی شائع ہوا۔ یہ کتاب چار سو ساٹھ صفحات سے زیادہ اور تین ضخیم ابواب میں ترانوے موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جس میں انہوں نے اپنے والدین، گھر، بچوں، شادی، ملازمت، دفتر میں عورتوں سے سلوک، پیشہ ورانہ زندگی، برطانیہ میں قیام، بی بی سی میں ملازمت، ملک کے سیاسی، معاشی اور سماجی معاملات گویا انہوں نے اپنی اب تک کی زندگی کے ہر تجربے، ہر مشاہدے اور ہر زاویے کو اپنی پوری سچائی کے ساتھ اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے، ماہ پارہ صفدر کی یہ کتاب ان کے پاکستان کے سیاسی اور ثقافتی سفر کا منظر نامہ بھی ہے۔

ماہ پارہ صفدر کی آپ بیتی ایک ایسی داستان ہے جس میں نسائی شعور اور تانیثی رویہ عملی طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔اس میں جہاں وہ پاکستان کی سیاسی و سماجی صورتحال کو بیان کرتی ہیں، وہیں انہوں نے اپنے دور میں خواتین کو درپیش تمام تر مسائل خواہ وہ تعلیم سے متعلق ہوں، روزگار سے متعلق یا پھر سماج میں صنفی امتیاز سے متعلق، ان تمام مسائل کو انہوں نے بہت جرات اور صداقت سے بیان کیا ہے۔ماہ پارہ نے اس آپ بیتی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں انہوں نے ساٹھ اور ستر کے عشرے میں اپنے لڑکپن، کالج اور یونیورسٹی کے دور میں نجی اور سماجی حالات کی منظر کشی کی ہے، جب لڑکیوں کو گھر سے نکلنے اور انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا رواج کم کم تھا، خواتین کے لیے چند مخصوص ذمہ داریوں کو اہم سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک طرح سے ان کی اجارہ داری تھی اور لڑکیوں کی اس شعبے میں ملازمت کی سماجی سطح پر حوصلہ شکنی کی جاتی تھی جس کا سامنا ماہ پارہ صفدر کو بھی کرنا پڑا۔ کتاب کا دوسرا حصہ ستر اور اسی کے عشرے میں رونما ہونے والے غیر معمولی واقعات پر مبنی ہے جو ماہ پارہ کے سامنے رونما ہوئے اور کچھ واقعات کا وہ خود بھی حصہ رہیں، جن کا تفصیلی ذکر انہوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ کتاب کا آخری اور تیسرا حصہ ایک میڈیا کارکن کی حیثیت سے لندن میں ماہ پارہ کے صحافتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں ماہ پارہ صفدر نے اپنی پیدائش سے جوانی تک کی زندگی، اپنے والدین کی شخصیت کے بیان، والدین کی جہد مسلسل، بیٹیوں کی پیدائش پر تعزیت کا زمانے کا بیان، زمانے کی روش سے ہٹ کر بیٹیوں کو پڑھانے لکھانے کا والدہ کا جنون اور والد کا ساتھ، اپنی زندگی کے اس دور میں ملکی سطح پر بدلتے منظر نامے، 1965ء میں بھارت سے جنگ، خوف وہراس میں گھرے دن رات کا بیان، 1971ء میں پاکستان کا اپنے ہی وجود کے ایک حصے (مشرقی پاکستان) سے جدا ہو کر ایک الگ ملک کی صورت اختیار کرنا اور اس کے پیچھے کے حقائق جو صحافت کی دنیا کا حصہ بننے پر ماہ پارہ پر کھلے، ان سب واقعات اور حالات کے بارے میں جو ماہ پارہ کے بچپن سے جوانی تک کے سفر میں رونما ہوئے، وہ سب اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ماہ پارہ صفدر نے اپنے خاندان کے حوالے سے ہجرت کے حالات وواقعات اور مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد چونکہ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں اور انہوں نے خود اس ہجرت کا تجربہ کیا ہے۔ماہ پارہ صفدر نے وہی حالات وواقعات درج کیے ہیں۔ دوسری

جانب ان بیانات نے سیاسی، سماجی اور ثقافتی منظر نامے کو پیش کیا ہے جن کو پڑھ کر اس دور کے حالات و واقعات سے مکمل طور پر آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہجرت کے دوران اور بعد میں ان کے خاندان کو درپیش مسائل کا بیان ماہ پارہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ہمارے والد، والدہ، نانی، بہنیں اور دوسرے عزیز اپنے اپنے آبائی گھر، اپنے قیمتی سامان، زیورات، اپنی زمینیں، اپنے ملازمین، اپنے کاروبار و روزگار گویا پر آسائش زندگیاں تیاگ کر ایک ایسے نو تشکیل ملک میں منتقل ہو رہے تھے جہاں نہ گھر بار تھا، نہ روزگار اور نہ یہ یقین کہ منزل تک پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ ہجرت میں کئی خاندان تو بکھر کر رہ گئے۔ کوئی آ سکا، کوئی نہیں آ سکا۔ کچھ ایسے بد نصیب بھی تھے جو پارٹیشن کا ایندھن بن گئے۔''[2]

ماہ پارہ نومبر 1954ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں جس کے چند عرصے بعد ہی خاندانی مسائل کی بنا پر انہوں نے لاہور سے خوشاب ہجرت کی۔ ماہ پارہ نے اپنے بچپن کا ابتدائی دور خوشاب ہی میں گزارا اور اس کے بعد تعلیمی مسائل کی وجہ سے ان کے والدین نے خوشاب سے سرگودھا منتقل ہونے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کی والدہ بچیوں کی تعلیم کو لے کر کافی پر عزم اور سنجیدہ تھیں اور انہی کی کاوشوں کا یہ نتیجہ کہ ماہ پارہ سمیت ان کی سب بیٹیاں اپنی اپنی زندگی میں اعتماد اور کامیابی کے ساتھ اعلیٰ مقامات پر فائز رہیں۔ جس دور میں مصنفہ نے آنکھ کھولی اور بچپن گزارا اس دور میں خواتین کی تعلیم کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن ماہ پارہ کے والدین نے اپنی بچیوں کی تعلیم کی خاطر خوشاب سے سرگودھا ہجرت کی اور ماہ پارہ نے اپنی ابتدائی تعلیم سرگودھا ہی سے حاصل کی۔ اس سے اس دور کی تہذیب اور سماجی صورتحال کا خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس ہجرت سے ماہ پارہ صفدر کے والدین کی روشن خیالی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جہاں لڑکیوں کا گھر سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس زمانے میں ماہ پارہ کے والدین نے اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے لیے تیسری ہجرت قبول کی۔ ماہ پارہ نے اپنی زندگی کو لفظوں میں اس طرح سمویا ہے کہ ان کا بچپن ان کے حالات و واقعات سب آنکھوں دیکھا حال محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ان کا بچپن ساٹھ ستر کے عشرے کا زمانہ ہے؛ جب خواتین کا گھروں سے نکلنا، تعلیم حاصل کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ایک سے زائد بیٹی کا پیدا ہو جانا کسی المیے سے کم نا ہوتا تھا۔ کیونکہ ہمارا معاشرہ قدامت پسندی، روایتی اقدار اور معاشرتی جکڑبندیوں میں جکڑا تھا۔ اس زمانے میں جہاں دیگر ممالک بنا کسی جنسی تفریق کے ترقی کی راہ پر گامزن تھے وہیں ہمارا معاشرہ اپنے فرسودہ خیالات اور روایات کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا، جو اس وقت کے لوگوں کے ذہنوں کو بری طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی خلاف ورزی یا ان روایات سے ہٹ کر سوچنے والوں یا عمل پیرا ہونے والوں کے خلاف ایک جم غفیر اشتعال برپا کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔ چونکہ ماہ پارہ کا خاندان ان فرسودہ خیالات اور روایات کا حامی نہ تھا اس وجہ سے انہیں کئی قسم کی مخالفتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، جو ان کے خاندان نے بہت ہمت اور دلیری سے کیا۔ پھر چاہے وہ چھ بیٹیوں کی پیدائش اور کسی بیٹے کے نہ ہونے پر بیٹیوں والے زیدی صاحب پکارے جانا ہو یا تعلیم کے حصول کی خاطر گھر سے اکیلے باہر نکلنے پر اہل علاقہ اور قریبی رشتہ داروں کے لفظی تیروں اور قطع تعلقی کی دھمکیوں کا سامنا ہو یا پھر بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں کسی غیر سید لڑکے سے رشتہ جوڑنے پر شیعہ برادری کا ان کے خاندان کا بائیکاٹ کر دینا اور اس نکاح کو رکوانے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہو، اس خاندان نے بہت دلیری اور حوصلے سے ان تمام مصائب و مشکلات کا مقابلہ کیا۔ آخر میں اللہ پاک نے ترقی و خوشحالی اور عزت و تکریم سے نوازا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو اتنا کمتر، حقیر اور بے ضرر بنا دیا گیا ہے کہ اس کا ہونا ایک بوجھ اور ذمہ داری کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی ذہن سازی عرصہ دراز عرصہ قدیم سے زندگی کا حصہ بن چکی ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی عورت اتنی محنت اور جہد مسلسل کے بعد بھی معاشرے میں وہ مقام حاصل نہیں کر پائی ہے جو معاشرے میں مردوں کو حاصل ہے۔ آج بھی عورت جگہ جگہ درندگی کا نشانہ بنتی رہتی ہے اور اپنے ہی قریبی رشتہ داروں کے ہاتھوں جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ کام کرنے کی جگہوں پر ہراسگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کمزور، نازک کلی، صنف نازک جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ آج بھی عورت کی گواہی کو آدھا ہی مانا جاتا ہے اور عورت کی بات کو صحیح ثابت کرنے

کے لیے اسے مردوں کی گواہی کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔آج بھی اپنی ہی جائیداد میں حصہ لینے کی خاطر اسے سب کی خفگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لالچی ہونے کے طعنے سننے پڑتے ہیں اور سب سے بڑھ کر المیہ اس پر یہ کہ بھائیوں کا خیال نہ ہونے کا بھی احساس دلایا جاتا ہے یعنی کہ پیدائش سے لے کر قبر میں اُترنے تک عورت کو قدم قدم پر یہ بات باور کروائی جاتی ہے کہ یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے، جہاں عورت ثانوی حیثیت رکھتی ہے ۔ایسے ہی معاشرے پر چوٹ کرتے ہوئے ماہ پارہ نے تلخ حقائق کو اپنی کتاب میں پیش کیا ہے:

> ''ہم ہمیشہ یہ سنتے اور پڑھتے رہے کہ قبل از طلوع اسلام بیٹی کی پیدائش کے بارے میں سنتے ہی مردوں کے چہرے سیاہ پڑ جایا کرتے تھے۔ہم نے کتابوں میں بھی یہ پڑھا کہ کچھ قبائل میں بچی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ کبھی آپ نے سوچا کہ قبائل لڑکیوں کو کیوں زندہ دفن کرتے تھے، کیونکہ اس زمانے میں جنگ و جدل معیشت کا اہم حصہ ہوتی تھی اور جنگ کے بٹوارے میں عورتیں اور لڑکیاں بھی مال غنیمت کی طرح تقسیم کی جاتی تھیں۔اسی لیے کچھ قبائل لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی دفنا دیا کرتے تھے۔ جنگوں میں عورت ہمیشہ مال غنیمت کی طرح تقسیم ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ اسلامی جنگوں میں بھی جاری رہا۔زندہ دفن ہو یا جنسی غلامی میں زندہ در گور۔عورت کی زندگی پر مرد کا اختیار رہا۔''[3]

ماہ پارہ صفدر نے اپنی اس آپ بیتی میں عورت کے مقام و مرتبے اور اس کی سماجی حیثیت کو ستر کی دہائی کے حوالے سے بیان کیا اور اس کا تجزیہ اور موازنہ آج کے جدید دور کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ان کے مطابق ان کی جوانی کے دور میں سماجی سطح پر عورت کے مقام و مرتبے یا لڑکی کے اچھے ہونے کا معیار اس کا جلد شادی ہو جانا اور خوبصورتی کا معیار گوری رنگت سے منسوب تھا۔آج بھی ہمارے معاشرے میں خوبصورتی کا معیار گورا رنگ ہی سمجھا جاتا ہے اور لڑکی کی جلد شادی گھر والوں کا خواب ہوتا ہے۔اس کی تعلیم اس کا کیریئر آج بھی سو فیصد نا سہی مگر پچاس فیصد اب بھی اندھیروں میں ہی گھرا نظر آتا ہے۔انہوں نے بیان کیا ہے کہ حالیہ برسوں میں ہمارے ملک میں خواتین کے حقوق کو یقینی بنانے کے لیے کافی قانون سازی ہو چکی ہے، مگر جہاں تک تبدیلی کی بات ہے تو زیادہ تر تبدیلی بڑے شہروں میں متوسط طبقے اور پروفیشنل والدین کی کلاس میں نظر آتی ہے، مگر عمومی طور پر بہت واضح فرق نہیں پڑا۔ان بیانات سے مصنفہ کے تانیثی شعور کا اندازہ ہو جاتا ہے۔وہ ایک ایسے معاشرے کی خواہش مند نظر آتی ہیں جہاں عورت کو ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ معاشرے میں سماجی و معاشرتی برابری حاصل ہو۔عورت صرف مرد کے تابع ہو کر زندگی بسر نہ کرے بلکہ اسے بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ بھی اپنی خواہشات، پسند ناپسند کے مطابق اپنی زندگی کے فیصلے کر سکے۔مذکورہ بیانات کو پیش کر کے مصنفہ نے عورتوں کے حقوق کے لیے ایک آواز اُٹھائی ہے۔عورت کے حقوق اور معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت کو متعین کرنے میں اس دور کی تہذیب و ثقافت کا اہم کردار ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر صائمہ فردوس اور ڈاکٹر عطاء الرحمن میو لکھتے ہیں:

> ''جب تانیثیت کے حوالے سے بات کی جائے تو عورت کی سیاسی و سماجی حیثیت جاننے کے لیے مختلف تاریخی ادوار میں سماج اور ان کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔دراصل سماج مجموعہ ہے ان افراد کا جو مشترکہ ثقافت رکھتے ہیں۔''[4]

ماہ پارہ صفدر نے اکیسویں صدی کے اس جدید دور میں بھی عورتوں کو جن سماجی اور معاشرتی مسائل کا سامنا ہے، انہیں آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ان کے مطابق آج بھی بہت سی لڑکیوں کو گھروں سے نکلنے، تعلیم کے لیے دور جانے یا ملازمت کرنے پر پابندیوں کا سامنا ہے۔آج بھی ایک لڑکی پہلے باپ پھر بھائی، شادی کے بعد شوہر اور شوہر کے بعد بیٹے کی بات ماننے پر مجبور ہے۔آج بھی عورت معاشرے میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہے اور صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے اور بھی کئی اسلامی ممالک میں صورتحال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انہوں نے عورتوں کے اپنے ہی رشتہ داروں کے ہاتھوں جنسی استحصال کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔اس حوالے سے وہ رقم طراز ہیں:

"عورت فاؤنڈیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق عورت اپنے ہی رشتے داروں کے ہاتھوں جنسی استحصال کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ عورتیں اور بچیاں اپنے باپ، بھائی، سسر اور چچا جیسے قریبی رشتے داروں کے ہاتھوں ریپ ہوتی رہتی ہیں کیونکہ لڑکیوں کو اس قدر کمتری کے احساس کے ساتھ پالا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہر قسم کی زیادتی برداشت کرتی رہتی ہیں مگر اپنا دفاع نہیں کر پاتیں۔اس کے اسباب کوئی ڈھکے چھپے نہیں، ہمیں اپنے چاروں طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔لڑکی کو بچپن سے ہی بطور کمتر مخلوق اور لڑکے کو عورت پر حکمرانی کے لیے پالا پوسا جاتا ہے۔"[5]

اس ساری صورتحال کے پیشِ نظر جب ہم آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے دور میں ماہ پارہ اور ان کے خاندان کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ماہ پارہ کی والدہ اپنی بیٹیوں کے حقوق کی خاطر، ان کی تعلیم کی خاطر زمانے کے سامنے ایک سیسہ پلائی دیوار کی مانند کھڑی دکھائی دیتی ہیں ۔عورت کی کمتر سماجی حیثیت کے ذمہ دار قوانین ہی نہیں سماجی رویے بھی ہوتے ہیں اور ان رویوں کی شروعات خود اپنے گھروں سے ہی ہوتی ہے، جہاں بچپن سے ہی لڑکیوں کو اس سوچ کے ساتھ بڑا کیا جاتا ہے کہ ان لڑکیوں نے پڑھ لکھ کر کونسا نوکریاں کرنی ہیں۔ماہ پارہ کی والدہ اور والد دونوں ہی اُن باشعور، دور اندیش اور زمانہ شناس لوگوں میں سے تھے جو وقت سے آگے دیکھتے اور سوچتے ہیں۔ انہوں نے اس زمانے میں اپنی بیٹیوں کو نہ صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ انہیں خود مختار اور بااختیار بھی بنایا تاکہ وہ معاشرے میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل بن سکیں۔ان کی والدہ نسائی شعور رکھنے والی پُر عزم خاتون تھیں جو خود تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود اپنی بچیوں کو تعلیم کی روشنی سے منور کرنے کی خواہشمند تھیں۔ماہ پارہ کے بقول کالج میں داخلے کے اخراجات کے لیے ان کی والدہ نے اپنے جہیز کے برتن تک بیچ ڈالے تھے مگر تعلیم کے حصول میں کسی بھی چیز کو رکاوٹ نہ بننے دیا۔اس خاندان کی خواتین میں نہ صرف ماہ پارہ نے اپنے زمانے کے سماجی اور ثقافتی ضابطوں کو توڑا بلکہ ان کی بہنوں نے بھی اپنی حیثیت معاشرے میں منوانے کے لیے بہادری سے مسائل کا سامنا کیا۔

ماہ پارہ کی زندگی کا ایک اہم حصہ سرگودھا میں گزرا ہے۔انہوں نے اس شہر کی تاریخ، اس کے اہم مقامات اور خاص طور پر اس کی ائیر بیس کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس لیے ان کی آپ بیتی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ ایک فردِ واحد کی زندگی کے حالات و واقعات کو صرف بیان نہیں کرتی بلکہ یہ ایک جگ بیتی بن جاتی ہے۔ جس میں اپنے دور کے سماجی و معاشرتی مسائل سے لے کر شہروں تک کا تذکرہ شامل ہے۔انہوں نے سرگودھا شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ سرگودھا شہر اپنے ہوائی اڈے کی وجہ سے مشہور ہے اور اس کی پہچان بھی پاک فضائیہ کا یہ اڈہ کرانہ نامی پہاڑیوں کے درمیان 1959ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ چاروں طرف پہاڑیوں سے گھرا ہونے کی وجہ سے محفوظ تصور کیا جاتا تھا۔ پہلے اسے پی اے ایف سرگودھا ایئر بیس کہا جاتا تھا مگر 2003ء میں ایئر چیف مارشل مصحف علی میر کی شہادت کے بعد اس کا نام بدل کر مصحف ایئر بیس رکھ دیا گیا۔ماہ پارہ کا بچپن سے جوانی تک کا سفر اسی شہر میں گزرا اور اس دوران جہاں انہوں نے معاشرے میں سماجی و تانیثی مسائل دیکھے اور ان کا سامنا کیا، وہیں ان کی زندگی کے اس دورانیے میں ہمارا ملک پاکستان بھی اپنی تاریخ کے اہم ترین دور سے گزرا۔ جہاں 1965ء کی جنگ میں بھارت کو شکست دے کر پاکستان نے ایسی تاریخ رقم کی جسے پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جاتا ہے اور دوسری طرف 1971ء کی جنگ میں پاکستان اپنے ہی وجود کے ایک حصے یعنی مشرقی پاکستان سے جدا ہو گیا۔انہوں نے اپنی آپ بیتی میں سیاسی اور تاریخی واقعات کو بھی بیان کیا ہے جس سے اس آپ بیتی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

1965ء کی جنگ کے وقت ماہ پارہ چھوٹی تھیں مگر تلخ یادوں کے ہیولے ذہن کے پردے پر کہیں نہ کہیں نقش موجود ہیں۔ماہ پارہ صفدر نے اس دور کے دیگر سیاسی اور تاریخی حالات و واقعات کو اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔انہوں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ تاشقند کے بارے میں بیان کیا ہے کہ جنوری 1966ء میں تاشقند میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کے مطابق دونوں ممالک کی

فوجیں اپنی اپنی سرحد پر واپس آ گئیں۔ 1965ء کی جنگ کے بعد پاکستان کو دوسری جنگ جو اپنے ہی ملک کے دوسرے حصے یعنی مشرقی پاکستان کے ساتھ ہوئی 1971ء میں سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ کے نتیجے میں ملک کا ایک حصہ اپنے دوسرے حصے سے جُدا ہو گیا۔ اُس وقت سن ستر کے انتخابات کے بعد سے کشیدہ ہوتے حالات اور مشرقی پاکستان میں ہونے والی گوریلا سرگرمیاں اس جنگ کا ایندھن بنیں، جس نے ملک پاکستان کو مزید دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کے اسباب، حقائق اور حالات و واقعات کو ماہ پارہ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان واقعات کے بیان سے مصنفہ کی سیاسی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنفہ چونکہ صحافت کی دنیا سے وابستہ تھیں اس لیے ان کی آپ بیتی میں اہم ملکی حالات و واقعات کا بیان ہوا ہے۔ اس سے ان کے سیاسی شعور کا بھی پتا چلتا ہے۔ سلمیٰ اعوان مصنفہ کے سیاسی شعور کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''مصنفہ کی سیاسی بصیرت یہ کہتی ہے کہ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آج پاکستان ایک مختلف ملک ہوتا۔ ان تجزیوں سے مصنفہ کے نا صرف سیاسی شعور کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ وطن سے محبت کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے جو ان کی مٹی سے جڑی زندگی اور محبت سے سرشار دھڑکتے دل کی علامت ہے۔''[6]

ماہ پارہ صفدر نے اپنی والدہ کی لڑکیوں کی تعلیم کے عزم کا بھی اظہار کیا ہے۔ انہوں نے ان کی طرزِ زندگی اور معاشی حالات کی تبدیلی کو بھی بیان کیا ہے۔ ان خاندان میں روپے پیسے کی فراوانی تو دور کی بات ضروریاتِ زندگی کا بہ مشکل اہتمام ہو پاتا تھا۔ مصنفہ کے نانا سید آصغر عباس زیدی کرنال کے نواب رئیس حامد علی خان کے نواسے تھے جو آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کی حکومت میں وزیر تھے۔ ان کی ماں سیدہ شمس الزہرہ زیدی جنہوں نے ایک پُر آسائش زندگی گزاری تھی، طرزِ زندگی میں یکدم تبدیلی اور معاشی تنگدستی کے گوناگوں مسائل کے باوجود لڑکیوں کی تعلیم کی شدت سے داعی تھیں۔ تعلیم کی اہمیت کا انہیں اس وقت سے احساس تھا جب تعلیم لڑکیوں میں تو کیا، لڑکوں میں بھی عام نہیں تھی۔ اس حوالے ماہ پارہ صفدر رقم طراز ہیں:

> ''میری ماں خود کسی کالج سے فارغ التحصیل نہیں تھیں، ان کا تعلق ایک ایسے سید اور نواب گھرانے سے تھا جہاں لڑکیوں کو زیورِ علم سے آراستہ تو کیا جاتا تھا مگر غیر رسمی طور پر۔ میری والدہ کو پڑھانے کے لیے استاد گھر میں آتے تھے مگر انہیں گھر سے باہر جا کر رسمی امتحان پاس کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ میری والدہ کو ہارمونیم سکھانے کے لیے بھی استاد آتے تھے۔ کاش ان کی آواز میں اِس گیت کی ریکارڈنگ ہوتی ''باغوں میں پڑے جھولے'' جو وہ ہارمونیم پر بہت ڈوب کر گاتی تھیں''[7]

مصنفہ کے مطابق ان کی والدہ ایک باکمال عورت تھی اور وہ روایتی گھرانوں کی عورتوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کی والدہ نے کبھی اپنے بیٹے کے نہ ہونے کو محرومی خیال نہیں کیا۔ وہ خود اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکیں مگر اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اس حوالے سے ماہ پارہ اپنی والدہ کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''پروردگار کے فضل و کرم سے ہم چھ بہنیں ہیں۔ سماجی رویوں کے برعکس میری ماں نے بیٹے کے نہ ہونے کو کبھی اپنی محرومی سمجھا ہی نہیں۔ انہوں نے کبھی بیٹیوں کو بوجھ نہیں جانا۔ بڑی بہنوں کو ابتدائی چار کلاسوں کی تعلیم انہوں نے خود گھر میں دی اور پانچویں کلاس سے سکول بھیجنا شروع کیا۔ ماں جو خود اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہی تھیں لہذا انہوں نے اپنی اس کمی کو اپنی بیٹیوں کی ذات میں پورا کیا اور ہم بہنوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پروفیشنل بنایا۔ اللہ نے بھی کیا خوب صلہ دیا میری ماں کو کہ ایسے داماد دیئے جو قابلِ رشک تھے اور جنہوں نے ہماری ماں کو ساس نہیں ہم سے بڑھ کر ماں کا درجہ دیا۔''[8]

مصنفہ کی صرف بہنیں تھیں ان کا کوئی بھائی نہیں تھا مگر انہوں نے اپنے بہنوئیوں کا ذکر اس محبت اور چاہت سے کیا ہے، جو محبت بھائیوں سے ہوا کرتی ہے۔ ان کے والدین نے بیٹوں کی کمی کو روگ ناتو خود کے لیے بنایا اور نہ ہی اپنی بیٹیوں کو کسی احساس محرومی میں مبتلا ہونے دیا۔

ماہ پارہ کے سب سے بڑے بہنوئی نایاب بھائی، ان کے بعد حبیب بھائی اور چھوٹے بہنوئی ابراہیم اور سلیم۔ ان سب سے ذہنی ہم آہنگی اس طرح سے تھی کہ ان سب کے درمیان کبھی غیریت کی دیوار حائل نہ ہوسکی، اس لیے کبھی انہیں بھائی کی کمی محسوس ہی نہ ہوئی۔ دنیا کی نظر میں اگر ماہ پارہ کے والدین کی زندگیوں میں کوئی کمی تھی تو وہ اللہ نے دامادوں کی صورت پوری کردی۔ ماہ پارہ کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ ماہ پارہ کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ، صحافتی دنیا میں قدم رکھنے کے عوض درپیش مسائل، رکاوٹوں اور اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی دنیا کے پوشیدہ حقائق اور معاشرے میں سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں کا مذہب کے نام پر دہرے معیار کا عملی مظاہرہ اور ماہ پارہ کے ملک چھوڑ کر لندن کا سفر طے کرنے کی کہانی کا بیان ہے۔

ماہ پارہ نے اپنی آپ بیتی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، وہ چونکہ ان دونوں اداروں سے وابستہ رہیں، اس لیے ان کی آپ بیتی میں ان کا تفصیلی ذکر ناگزیر تھا۔ انہوں نے پاکستان میں ٹیلی ویژن کی پہلے اسٹیشن کے بننے سے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے بیان کیا ہے کہ پاکستان کا پہلا ٹی وی سٹیشن 26 نومبر 1964ء کو لاہور میں اور دوسرا اسٹیشن اگلے ہی ماہ دسمبر 1964ء میں سابق مشرقی پاکستان کے دار لحکومت ڈھاکا میں قائم ہوا۔ ماہ پارہ نے جب پنجاب یونیورسٹی سے کیمرے تک کے سفر کا آغاز کیا تھا اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار کے آخری چند ماہ تھے۔ سرکاری میڈیا میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے چرچے تھے۔ ماہ پارہ نے اپنی کتاب میں اس واقعے کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ماہ پارہ اپنے کیریئر کے حوالے سے دو اہم ترین خبروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''شعبہ خبر سے وابستگی کے دوران دو خبریں ایسی تھیں جن میں سے ایک پڑھ کر افسوس ہوا اور ایک نہ پڑھ کر۔ ایک نوخیز جمہوریت کی موت کی خبر تھی اور ایک آمریت کی۔''[9]

ماہ پارہ نے جہاں اپنی ذاتی زندگی کو اس کتاب میں پیش کیا ہے وہیں شعبہ خبر سے وابستگی کی وجہ سے ایسے حقائق بھی اس کتاب کا حصہ ہیں جو کہ ہمیں اپنی پوری سچائی کے ساتھ دیگر کتب میں نہیں ملتے۔ یہاں ماہ پارہ کی آمر سے مراد اس وقت کا جنرل صدر ضیاء الحق اور نووارد جمہوریت سے مراد ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اس جرم کی سزا کے طور پر پھانسی دی گئی جو انہوں نے سرے سے کیا ہی نہیں اور ان کی پھانسی کی خبر بھی اس طرح سے نشر کی گئی جیسے یہ کوئی اہم خبر ہی نا ہو اور ایسے وقت میں کی گئی جب کم سے کم لوگ اسے سُن سکیں۔ پروفیشنل لائف میں ذاتی اور جذباتی وابستگی سے ہٹ کر اہمیت اس امر کی ہوتی ہے کہ خبر کتنی اہم ہے۔ ماہ پارہ کے لیے یہ دونوں مواقع ہی بہت اہم تھے مگر دونوں مرتبہ ہی انہیں صنفی امتیاز کا احساس دلایا گیا، ان سے بھٹو کی موت کی خبر پڑھنے کی تصدیق بار بار کی گئی۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''بظاہر وہ روشن دن تھا مگر تاریک سا نظر آرہا تھا۔ میں ایک لمبے سفر کے بعد گھر پہنچ کر ٹی وی پر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اتنے میں پی ٹی وی نیوز روم سے ہمارے نیوز پروڈیوسر کا فون آگیا، خاصی گھبراہٹ زدہ آواز میں۔ خبر تو سن لی ہو گی آپ نے، میرے ہاں کہنے پر بولے، "بھٹو کی پھانسی پڑھ لیں گی آپ؟ میرے اطمینان دلانے پر ان کی تسلی ہوئی۔ فون کی گھنٹی پھر بجی، اس مرتبہ خود نیوز کنٹرولر حبیب اللہ فاروقی لائن پر تھے۔ بولے: دیکھیں بی بی بھٹو کی پھانسی کی خبر پڑھ لیں گی آپ؟ کہیں رو تو نہیں پڑیں گی۔''[10]

ماہ پارہ نے جہاں اپنی آپ بیتی میں عورتوں کے مسائل، معاشرے میں سماجی برابری اور کام کرنے کی آزادی سے متعلق بات کی، وہیں انہوں نے کام کے دوران جس طرح عورت کو صنفی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کو بھی بیان کیا ہے۔ سن 1988ء میں جنرل ضیاء کی ایک حادثے کے باعث ہونے والی موت کی خبر پڑھنے سے ماہ پارہ کو یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ ''یہ بڑی سنجیدہ خبر ہے آپ لوگوں نے میک اپ کیا ہوتا ہے تو اچھا نہیں لگتا، یہ خبر کوئی مرد ہی پڑھے تو بہتر ہے'' عورتوں کے ساتھ صنفی امتیاز کی ایسی کئی مثالیں دیکھنے کو ملیں گی جہاں پروفیشنلزم کو پیچھے چھوڑ کر صرف اور صرف صنفی سطح پر سوچ کو محدود کرکے فیصلے لیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے سماج کا ایک بنیادی مسئلہ ہے جس کی طرف مصنفہ نے توجہ

دلوائی ہے۔اکثر خواتین کو کام کرنے کی اجازت تو مل جاتی ہے مگر کام کے دوران ان کی قابلیت اور ذہانت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی صنف کی بنیاد پر کام کروایا جاتا ہے۔۔

ماہ پارہ کی کتاب کا تیسرا حصہ ان کے لندن میں بی بی سی سے منسلک ہونے، نئے دیس، نئے شہر، نئے لوگوں سے حاصل ہونے والے تجربات اور اپنے کام کے باعث سماجی سطح پر باہر کے ملکوں میں جنسی تضاد سے ہٹ کر یکساں سلوک کے بیان پر مشتمل ہے۔ماہ پارہ جب بی بی سی لندن میں اپنی خدمات سرانجام دینے گئیں تو انہوں نے وہاں کے شب و روز اور حالات و واقعات کو اپنی آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔انہوں نے وہاں رضا علی عابدی، راشد اشرف اور سارا نقوی سے اپنی پہلی ملاقات کا احوال بھی بیان کیا ہے۔انہوں نے پروگرام ''سیر بین'' میں شامل ہو کر ان شخصیات کے ساتھ کام کیا۔مصنفہ نے آپ بیتی کو محض اپنی زندگی کے واقعات اور ذاتی تجربے یا مشاہدے کے بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ تاریخی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل اور معلومات بھی اپنے قارئین تک پہنچا دی ہیں۔انہوں نے لندن میں بی بی سی اردو سروس کے آغاز کا بھی بیان کیا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

''بی بی سی اردو سروس ہندوستانی سروس کے نام سے دوسری عالمی جنگ کے دوران انیس سو چالیس میں شروع ہوئی تھی۔بی بی سی کی اپنی لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق اس کی بنیاد رکھنے والوں میں برصغیر کے ممتاز براڈ کاسٹر اور ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری اور ادیب و اداکار بلراج ساہنی جیسے لوگ شامل تھے۔برِصغیر کی تقسیم کے دو برس بعد یہ ہندوستانی اور پاکستانی سروس تقسیم ہو گئی اور انیس سو چھیاسٹھ میں اِس کا نام ہندی اور اردو سروس ہو گیا۔حالاتِ حاضرہ کا پروگرام بی بی سی اردو سروس سے پہلے بھی نشر ہوتا تھا مگر سیر بین کے نام سے یہ 1968ء سے نشر ہو رہا تھا"[11]

مصنفہ نے پروگرام ''سیر بین'' کا تعارف، مقاصد اور اس کے سامعین کے حوالے سے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ان کے مطابق سامعین ادارے کو لکھتے تھے کہ انہیں اس پروگرام سے نہ صرف پاکستان اور انڈیا بلکہ جنوبی ایشیا سمیت دنیا بھر میں رونما ہونے والے اہم واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔ان کے مطابق اس پروگرام کی ساکھ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس بات کو یقینی بنایا جاتا تھا کہ بی بی سی سے نشر ہونے والی کسی خبر کی کبھی تردید نہ ہو۔خبر نشر کرنے سے پہلے کم از کم دو آزاد ذرائع سے اس کی تصدیق کی جاتی تھی۔مصنفہ نے بی بی سی میں سامعین کی آراء کی اہمیت کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس ادارے میں سامعین کے فیڈ بیک کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔اس کے لیے سب زبانوں کے سامعین کے خطوط کا ریکارڈ اور ریسرچ کے لیے ایک الگ شعبہ تھا۔مصنفہ نے صحافتی دنیا کے اصولوں سے بھی عام قارئین کو آگاہ کیا ہے۔غیر جانبداری کو انہوں نے صحافت کے حوالے بنیادی اور سب سے اہم اصول قرار دیا ہے۔مگر اس حوالے سے انہوں نے خوف و ہراس کے دور میں غیر جانب دار رپورٹنگ کو مشکل بھی قرار دیا جس سے ہر صحافی کو گزرنا پڑتا ہے۔انہوں نے اس حوالے سے پاکستانی معاشرے کے حقائق کو قلم بند کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''خوف و ہراس کی فضاؤں میں غیر جانبدار رپورٹنگ کے لیے کس قدر خطرات سے گزرنا پڑتا تھا آج کل تو اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔نوے کے عشرے میں جب کراچی میں ایم کیو ایم بہت سر گرم تھی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔نامہ نگار ظفر عباس کو اغوا کر کے ان پر شدید قسم کا تشدد کیا گیا۔دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان امریکا کا اتحادی تھا مگر افغانستان سے جنگجوؤں کی لاشیں پاکستان آتی تھیں۔اسی قسم کی ایک رپورٹ پر دلاور خان وزیر لا پتا کر دیئے گئے۔تین دن تک ایجنسی کی قید میں رہے۔اِس دوران کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔وہ رِہا تو ہو گئے، مگر ظاہر ہے شدید اعصابی دباؤ میں تھے۔انھیں کچھ ہفتوں کے لیے لندن بلا لیا گیا تھا۔انہوں نے جو کچھ بتایا، میرے لیے اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔''[12]

مصنفہ نے یہاں بھی کام کے دوران صنفی امتیاز کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔''سیر بین''پروگرام صرف مرد حضرات کرتے تھے یا کبھی کبھار کوئی سینئر خاتون۔مگر مصنفہ خواتین میں پہلی مرتبہ اس پروگرام میں تواتر سے مدیر بھی رہیں اور پیش کار بھی۔انہوں نے اپنی قابلیت،ذہانت اور محنت سے یہ مقام و مرتبہ حاصل کیا کہ ایک ایسا پروگرام جہاں پر پہلے صرف مردوں کی اجارہ داری تھی،انہوں نے اس پروگرام میں بھرپور شرکت کی۔ان کے بعد خواتین کی اس پروگرام میں بطور مدیر اور پیش کار کے شرکت کا سلسلہ چل نکلااور بہت سی خواتین نے اس معروف پروگرام کو چلایا۔

مصنفہ کے مطابق لندن میں بی بی سی کی عمارت کو''بش ہاؤس''کے نام سے جانا جاتا تھا۔انہوں نے اس عمارت کی تعمیر،اس کی ثقافتی حیثیت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ان کے مطابق شہر کے ثقافتی اور سیاحتی وسط میں واقع لندن کے قدیمی اور روایتی طرز تعمیر کی حامل سرخ اینٹوں سے بنی کئی منزلوں پر مشتمل یہ بڑی عمارت خود لندن کی ثقافت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔یہ عمارت 1941ءسے 2012ءتک ستر برس برطانیہ کی عالمی سروس کی نشریات کا ہیڈ کوارٹر بنی رہی،جو اس وقت عالمی نشریات کا دنیامیں سب سے بڑا ادارہ تھا۔ماہ پارہ صفدر نے لندن کی تہذیب و ثقافت اور روایات کو بھی اپنی آپ بیتی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ماہ پارہ نے اپنے صحافتی کیریئر کے دوران متعدد نامور شخصیات کے انٹرویوز کیے جن کا تعلق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے رہا۔بی بی سی میں ملازمت کے دوران انہوں نے ادب کے حوالے سے ادب کی کلاسیکی قد آور شخصیات کے انٹرویوز کیے۔جن میں افسانہ وناول نگار انتظار حسین اور الطاف فاطمہ،شاعر و ادیب احمد ندیم قاسمی اور شاعر منیر نیازی شامل ہیں۔ان انٹرویوز کی چند جھلکیاں ماہ پارہ نے اپنی کتاب میں دکھائی ہیں جس میں سماج اور ادیب کو لے کر ہر ایک کی اپنی رائے ہے،جہاں احمد ندیم قاسمی یہ سمجھتے ہیں کہ ادب کو ہر زمانے میں مشکلات کا سامنا رہا ہے مگر وہ کبھی جمود کا شکار نہیں ہوا اور اگلی نسل بھی اچھا ادب تخلیق کرے گی۔وہیں انتظار حسین اس بات پر تو متفق ہیں کہ ادیب ہمیشہ معاشرے سے لڑ کر لکھتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آج کے ادیب نے معاشرے سے لڑنا چھوڑ دیا ہے اور اب وہ سمجھوتہ کر کے لکھتا ہے۔الطاف فاطمہ کے نزدیک ہمارے ادب میں وہ شدت نہیں آئی جو دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپی اور روسی ادب میں نظر آئی۔ان کا ماننا ہے کہ بعض ادیبوں نے اشاریت اور تجریدیت سے اس قدر کام لیا کہ عام قاری تک ان کی بات پہنچ ہی نا سکی۔ منیر نیازی سامعین سے یہ گلہ کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ کوئی نیا شعر،نئی نظم،نئی غزل نہیں سننا چاہتے۔کوئی نیا شعر لکھو تو سننے والا نہیں ملتا۔

مصنفہ 1993ءمیں فن و ثقافت پر ایک سیریز کے لیے لاہور آئیں جہاں انہوں نے بڑے بڑے اداکار اور فنِ موسیقی سے وابستہ بڑے تخلیق کاروں کے انٹرویوز کیے،جن میں موسیقار بابا چشتی،گیت نگار مسرور انور،صبیحہ خانم،محمد علی،زیبا،شمیم آرا،منور سعید،ندیم،قوی خان اور علی اعجاز شامل ہیں ان کے علاوہ گلوکار مہدی حسن،فریدہ خانم،ثریا ملتانی کے بھی انٹرویوز کیے جن کو اپنی یادوں کا قیمتی اثاثہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے ان انٹرویوز کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ماہ پارہ نے 2005ءمیں ایران،2006ءمیں شام،2009ءمیں مصر اور 2016 ءمیں عراق کا سفر کیا۔اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے دیگر تجربات اور مشاہدات کو کتاب کا حصہ بنایا وہیں اپنے اسفار کے دوران نظر آنے والی وہاں کی تہذیب و ثقافت کو بھی اپنی کتاب میں قلمبند کیا ہے۔ماہ پارہ نے''ہم وطن واپس کیوں نہیں آئے''کے عنوان سے پاکستان واپس نہ آنے کی وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے وطن واپس نا آنے کا سبب پاکستان کی سماجی اور معاشی خرابی اور سیاسی عدم استحکام کے باعث دن بدن گرتی معیشت کو قرار دیا ہے۔اس باب میں انہوں نے پاکستان کے غیر اطمینان بخش تعلیمی معیار،روزگار کے مسائل اور سماجی سطح پر طبقاتی تفریق کے باعث سامنے آنے والے کئی پیچیدہ مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔کتاب کے آخر میں انہوں نے اپنی تخلیقات پیش کی ہیں جن مین ان کی غزلیں،نظمیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ان کی نظموں میں خیال دریچے،سنو،شام کی دہلیز پر،اک خواب شامل ہیں۔

ماہ پارہ صفدر کی یہ آپ بیتی جہاں ان کی زندگی کے حالات و واقعات کے بیان پر مشتمل ہے، وہیں اس میں مصنفہ نے اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی و سماجی حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کی آپ بیتی ان کی زندگی کے جملہ اہم حالات و واقعات کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے مختلف سماجی اور سیاسی مسائل کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ جس سے ان کی آپ بیتی ایک جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی اس آپ بیتی سے گزشتہ دور ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے اہم تہذیبی اور سیاسی واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصنفہ نے آپ بیتی میں خواتین کو درپیش مختلف مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی جوانی اور لڑکپن میں جن سماجی بندشوں کا سامنا کیا، انہیں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت اور مساوی حقوق کی طرف توجہ دلوائی ہے۔ انہوں نے عورتوں کے سماجی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی مسائل سے لے کر صحت کے مسائل تک کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے کام کے دوران عورتوں کے حوالے سے صنفی تفریق کو بھی پیش کیا ہے۔ خود ماہ پارہ کی زندگی عورتوں کے سماجی مسائل اور ان کے حل کا عملی نمونہ ہے۔ مجموعی طور پر ماہ پارہ صفدر کی آپ بیتی ان کی زندگی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت اور عورتوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد کو بیان کرتی ہے۔

حوالہ جات

1 ڈاکٹر سید عبداللہ، **اردو میں آپ بیتی، مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء**، مرتبہ: فرمان فتح پوری، (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2013ء)، ص353-

2 ماہ پارہ صفدر، **میرا زمانہ میری کہانی**، (جہلم: بک کارنر، 2024ء)، ص34-

3 ایضاً، ص42-

4 سائمہ فردوس، ڈاکٹر عطاء الرحمن میو، **تانیثیت: سماجی وثقافتی پہلو**، مشمولہ جہانِ تحقیق، شمارہ 2021ء)، ص14-

5 ماہ پارہ صفدر، **میرا زمانہ میری کہانی**، (جہلم: بک کارنر، 2024ء)، ص44-

6 سلمیٰ اعوان، مضمون: **مہ پارہ نے "میرا زمانہ، میری کہانی" میں ایک پورا عہد رقم کر دیا**، 2 نومبر 2025ء،
https:// urdu. Nayadaur .tv/ 03-Jul-2023/23688

7 ماہ پارہ صفدر، **میرا زمانہ میری کہانی**، (جہلم: بک کارنر، 2024ء)، ص90-

8 ایضاً، ص91-

9 ایضاً، ص166-

10 ایضاً، ص170-

11 ایضاً، ص270-

12 ایضاً، ص271-